عہدِ وسطیٰ کا ایک زبردست فلسفی

سپینوزا

(۱۶۳۲ — ۱۶۷۷)

(از جناب طفیل عبدالرحمٰن صاحب بی اے)

یہودیوں کی تاریخ آغازِ عیسائیت ہی سے ایک المناک فسانہ ہے۔ ۷۰ء میں جب یروشلم پر روما قابض ہوگیا تو اس قوم نے اپنی جنم بھومی کو خیرباد کہا۔ اس وقت سے یہ قوم خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہی ہے۔ باوجودیکہ دنیا کے دو بڑے مذاہب (اسلام وعیسائیت) اس سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہے ہیں، جاگیرداری نظام نے اُسے زمین کی ملکیت سے اور پیشہ وروں کی انجمنوں نے دستکاری میں حصہ لینے سے ایک مدت تک روکے رکھا۔ اسے تنگ وتاریک گوشوں میں بند کردیا گیا۔ اور صرف حقیر ترین کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی۔ عوام نے اس پر طرح طرح کے ستم ڈھائے اور شہنشاہیت نے بجا و بے جا طور پر اس کی پونجی پر ہاتھ صاف کئے۔ غرض اس میں سیاسی نظام اور عمرانی اتحاد کے لئے کسی جبر کے نہ ہونے کے باوجود، یہاں تک کہ کسی متحدہ زبان کی عدم موجودگی میں بھی، اس عجوبہ روزگار قوم نے اپنے جسم و روح کو فنا نہیں ہونے دیا بلکہ اپنی نسلی اور تمدنی ہیئت کو برقرار رکھا، نیز اپنی قدیم ترین رسومات اور روایات کی بہت سختی سے حفاظت کی اور نہایت صبر و استقلال سے اپنے "یوم نجات" کی منتظر رہی۔ ان سب مزاحم کے ہوتے ہوئے اس کی تعداد ہمیشہ بڑھتی رہی اور اس نے کئی ایک عظیم الشان شخصیتوں کو جنم دیا۔ اس طرح اس قوم کی تاریخ دنیا کے عظیم ترین افسانوی رومانوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

اپنے وطن سے نکل کر یہودی مہاجر بحیرہ روم کے ارد گرد کے سب ممالک میں پھیل گئے اور آخر کار ان کی جماعت دو بڑی شاخوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ دریائے ڈینیوب اور رائن کے کنارے کنارے بڑھتا گیا اور آخر کار پولینڈ اور روس میں جاگزیں ہوا۔ دوسرا گروہ فاتح مُوروں (Moors) کے ساتھ ساتھ کوچ کرتا ہوا ۷۱۱ء میں سپین اور پرتگال میں آن بسا۔ وسطی یورپ میں ان لوگوں نے سوداگروں اور ماہرین مالیات کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ اور جزیرہ نمائے آئبیریا میں انھوں نے اہلِ عرب کے علوم و فنون — ریاضی، طب اور فلسفہ — بہت ذوق و شوق سے حاصل کئے۔ قرطبہ، بارسلونا اور اشبیلیہ کی یونیورسٹیوں میں اپنے علیحدہ تمدن کی بنا ڈالی اور اس جگہ بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں عربوں کے دوش بدوش انھوں نے بھی قدیم اور مشرقی تہذیب کو مشرقی یورپ میں ترویج دینے کا اہم کام کیا۔

سپین میں ان کے اقبال کا ستارہ عربوں کے عروج اور زوال کے ساتھ ساتھ طلوع اور غروب ہوا۔ ۱۴۹۲ء میں جب فرڈیننڈ نے غرناطہ کو فتح کر کے مُوروں کو سپین سے نکالا تو ان کی آزادی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اسلامی رواداری کے مقابلہ میں نئے فاتحوں نے ان کے سامنے صرف دو صورتیں پیش کیں۔ بپتسمہ لیکر قبولِ عیسائیت یا مال و ملکیت کی ضبطی اور جلاوطنی ان کی ایک بڑی اکثریت نے مؤخر الذکر صورت کو قبول کیا اور کسی جائے پناہ کی تلاش میں پا بہ رکاب ہو گئے۔ کئی ایک نے اٹلی کی بندرگاہوں میں داخل ہونے کی ناکام کوشش کے بعد سخت تکالیف کے درمیان افریقہ کے ساحل کا رخ کیا۔ جہاں پہنچکر ان میں سے اکثر صرف اس شبہ کی بنا پر تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے کہ انھوں نے جواہرات نگل لئے ہیں۔ ان کی ایک بڑی جماعت اس زمانہ کے کمزور جہازوں میں سوار ہو کر دو مخالف ملکوں (انگلستان اور فرانس) کے درمیان سے ہوتی ہوئی اٹلانٹک سمندر کے شمال کی طرف روانہ ہوئی اور آخر کار ایک چھوٹے لیکن وسیع القلب ملک ہالینڈ نے انھیں خوش آمدید کہا۔ اسی گروہ میں پرتگالی یہودیوں کا ایک قبیلہ اسپینوزا بھی تھا۔ ہمارا فلاسفر اسی قبیلہ کا ایک فرد تھا۔

حالاتِ زندگی | وہ ۲۴ نومبر ۱۶۳۲ء کو ایمسٹرڈم میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ مائیکل ایک کامیاب سوداگر تھا لیکن اُسے تجارت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنا سارا وقت مذہبی درسگاہ میں گذارتا تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے اپنے مذہب اور اپنی قوم کی تاریخ پر عبور حاصل کرلیا۔ اور ایک ممتاز عالم بن گیا۔ اس کے بزرگوں کی بہت سی امیدیں اس سے وابستہ تھیں، ان کا خیال تھا کہ یہ نوجوان ہمارے مذہب اور ہماری قوم کا نام روشن کرے گا۔ بائیبل کے مطالعہ کے بعد اس نے اپنے زمانہ کے سب بڑے بڑے مصنفین کی کتابوں کو چھان ڈالا۔ اس کا مطالعہ گہرا اور اس کا علم وسیع ہوتا گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے سادہ عقائد شکوک وشبہات میں بدلتے گئے۔

قدیم علوم وفنون کے خزانوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اس نے ایک ولندیزی عالم سے لاطینی زبان سیکھی شروع کی۔ اس کا استاد خود مذہبی لحاظ سے آزاد خیال اور مذہبی اور سیاسی عقائد کا مبصر ہونے کے علاوہ ایک دلیر انسان بھی تھا۔ یہانتک کہ اپنے دارالمطالعہ کے پُرامن گوشوں سے نکل کر وہ فرانسیسی بادشاہ کے خلاف ایک سازش میں شریک ہوا اور ۱۶۷۴ء میں تختۂ دار کو زینت بخشی۔ اس کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ سپینوزا کے دل میں لاطینی زبان کا شوق اور استاد کی لڑکی کی محبت ایک ساتھ پروان چڑھے۔ لیکن اس کی محبوبہ اتنی ذہین نہ تھی کہ سپینوزا کی قابلیتوں کا صحیح اندازہ لگا سکتی۔ اس لئے جب ایک اور امیدوار نے دل کے ساتھ بیش بہا تحائف بھی پیش کئے تو اس نے ایسا اہم موقع ہاتھ سے کھونا مناسب نہ سمجھا اور اسپینوزا کی طرف سے بے رخی اختیار کرلی۔ شاید اس شکست ہی نے ہمارے ہیرو کو فلاسفر بنایا۔

محبت کی بازی تو وہ ہار گیا۔ لیکن علم کے میدان میں اس نے مکمل فتح حاصل کی۔ لاطینی زبان نے اس پر قدیم علوم وفنون کے دروازے کھول دیئے۔ اس نے سقراط، افلاطون۔ ارسطو۔ ڈے کارٹ۔ اپیکیورس اور لکریٹیس (Lucretius.) کی کتب کا مطالعہ کیا۔ اس میں رواقی (Stoic) اور متکلمانہ (Scholistic.) فلسفہ کے

اثرات بھی ملتے ہیں۔ داخلی (Subjective) اور مثالی (Idealistic.) فلسفہ کے باوا آدم ڈے کارٹ کے خیالات سے وہ خاص طور پر متاثر ہوا۔

دوسرے طلبا کے سامنے وہ اپنے آزاد خیالات کے اظہار سے نہیں جھجکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بائبل میں اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ خدا مجسم نہیں ہے یا فرشتوں کی بھی کوئی حقیقت ہے۔ یا روح غیر فانی ہے۔ ان خیالات کی بھنک مذہبی مجلس تک بھی پہنچی۔ جس نے اسے بدعتی قرار دے کر ۱۶۵۶ء میں باز پرس کے لئے طلب کیا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس نے اپنی صفائی میں کیا کچھ کہا۔ لیکن ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ اسے قریباً بارہ سو روپیہ سالانہ بطور وظیفہ کے اس شرط پر پیش کیا گیا کہ وہ کم از کم بظاہر اپنے مذہب کی پاسداری بلحوظ رکھے اور اپنے خیالات زبان پر نہ لائے۔ لیکن اس نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۷ جولائی ۱۶۵۶ء کو اُسے اسرائیلی رسومات کے تمام تکلفات کے ساتھ جماعت سے خارج کر دیا گیا۔

آج ہمارے لئے اس سزا کی سختی کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ تنہائی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ اور ایک اسرائیلی کی اپنی جماعت سے علیحدگی تو گویا قید تنہائی کی انتہائی صورت ہے۔ اپنے آبا و اجداد کے مذہب سے دست بردار ہونے کا زخم ابھی مکمل طور پر مندمل نہیں ہوا تھا کہ اس کے سر پر اس "قید تنہائی" کی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ اس کے پرانے دوستوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ اس کے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا۔ اس کی بہن نے اسے تھوڑے سے ورثہ سے بھی محروم کرنا چاہا۔ لیکن اس نے بہن کے خلاف عدالتی کارروائی کی۔ مقدمہ جیت لیا۔ اور وہی ورثہ پھر بہن کے سپرد کر دیا۔ اس کی قوم نے اُسے ایک بیکار عضو کی طرح کاٹ کر پھینک دیا۔ وہ اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگا۔ مگر قدرت کو اسے یہودیت کے تنگ دائرے سے نکال کر بین الاقوامی شہرت کے تخت پر جلوہ گر کرنا تھا۔

اس جماعتی اخراج کے بعد ہی ایک اور تلخ واقعہ پیش آیا۔ رات کے وقت جب وہ بازار میں سے گزر رہا تھا۔ ایک تقدس مآب بدمعاش جو اس کے قتل سے اپنی تقدیس کی نمائش کرنا چاہتا تھا اس پر چھری سے حملہ آور ہوا۔ لیکن اس نے فوراً پیچھے کو ہٹ کر اپنی جان بچالی۔ صرف گردن پر معمولی سا زخم آیا۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ فلسفیوں کے لئے اس وسیع دنیا میں کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے۔ اس لئے اس نے شہر سے باہر ایک چھوٹا سا کمرہ لے لیا۔ اور وہاں رہنے لگا۔ اس کا میزبان اور اس کی بیوی عیسائی تھے۔ وہ اس کے مغموم اور پُر رحم چہرے سے بہت جلد مانوس ہو گئے۔ جب وہ کبھی کبھار شام کے وقت ان کے پاس آن بیٹھتا، ان سے مل کر سگار نوشی کرتا اور انھیں کی سادہ زبان میں ہم کلام ہوتا تو اُن کو بے انتہا خوشی ہوتی۔ پہلے پہل وہ ایک سکول میں بچوں کو پڑھا کر اپنی روزی کماتا تھا۔ پھر لینز (Lens) بنانے کا پیشہ اختیار کیا اور عینکوں۔ دوربینوں اور خوردبینوں کے شیشے تیار کرنے میں ماہر ہو گیا۔

پانچ سال کے بعد ۱۶۶۰ئہ میں اس کا میزبان لیڈن کے قریب رائنز برگ میں چلا گیا۔ سپینوزا نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ وہ جس مکان میں رہتا تھا وہ اب تک موجود ہے اس کی بود و باش "سادہ زندگی اور اعلیٰ خیالات" کا مکمل نمونہ تھی۔ وہ کئی دفعہ دو دو تین تین دن تک اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتا تھا۔ یہانتک کہ اپنا کھانا بھی وہیں منگا لیتا۔ اپنی محنت سے اتنا کما لیتا جو اس کی سادہ ضروریات کے لئے کافی ہوتا اور نہایت اطمینان اور سکون سے رہتا۔ اس پانچ سال کے عرصہ میں اس نے اپنی دو کتابیں "ذہنی اصلاح" (Improvement of the Intellect) اور "اخلاقیات" (Ethics) لکھیں۔ ثانی الذکر ۱۶۶۵ئہ میں مکمل ہوئی۔ لیکن اس کے چھپنے کی نوبت ۱۶۷۷ئہ میں آئی۔ جب اس کا مصنف جسمانی طور پر اس دنیا میں موجود نہ تھا۔

۱۶۶۵ئہ میں وہ ہیگ کے ایک قصبہ وور برگ میں چلا گیا اور ۱۶۷۵ئہ میں ہیگ

ہی میں آگیا۔ اب اس کی واقفیت کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا اور اس کے دوستوں اور خیراندیشوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ جماعتی اخراج اور مذہبی فتووں کے باوجود اس نے اپنے ہمعصروں میں بہت عزت حاصل کرلی تھی۔ یہاں تک کہ ۱۶۷۳ء میں اسے ہیڈلسبرگ کی یونیورسٹی میں معلم فلسفہ کا منصب اس شرط کے ساتھ پیش کیا گیا کہ وہ تسلیم شدہ مذہب کے خلاف اعتراض اٹھانے سے باز رہے گا۔ اس نے شکریہ کے ساتھ انکار کردیا۔

۱۶۷۷ء اس کی زندگی کی کتاب کا آخری باب تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۴۴ سال کی تھی۔ اس کے دوست جانتے تھے کہ وہ تھوڑے ہی عرصہ کا مہمان ہے وہ مدقوق والدین کے ہاں پیدا ہوا تھا۔ اس کی زندگی کا زیادہ حصہ تنگ و تاریک مکانوں اور گردآلود فضا میں گذرا تھا۔ روز بروز اس کے پھیپھڑے خراب ہوتے گئے اور ضیق النفس کی شکایت بڑھتی گئی۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی زندگی کے دن تھوڑے ہیں۔ اسے صرف ایک ہی خیال ستاتا تھا اور وہ یہ کہ جس کتاب کو وہ اب تک چھپوانے کی جرأت نہ کرسکا تھا (یعنی اخلاقیات) کہیں اس کی موت کے بعد تلف نہ ہوجائے۔ اس لئے اس نے اس کتاب کا مسودہ ایک ڈیسک کے اندر مقفل کردیا اور اس کی چابی اپنے میزبان کے حوالہ کردی اور اسے تاکید کردی کہ اس کے مرنے کے بعد وہ ڈیسک اور چابی ایمسٹرڈم کے ایک پبلشر کے سپرد کردی جائے۔

۲۰ فروری کو اتوار کے دن اس کا میزبان اپنے اہل و عیال سمیت عبادت کے لئے گرجا جا رہا تھا تو اسپینوزا نے اُسے یقین دلایا کہ اس کی طبیعت غیر معمولی طور پر خراب نہیں ہے صرف ڈاکٹر میئر اس کے پاس رہا۔ جب وہ واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ فلاسفر اپنے دوست کی آغوش میں ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے۔ اس کی موت کے غم میں عالم اور جاہل برابر کے شریک تھے کیونکہ جس طرح پڑھے لکھے لوگ اس کی قابلیت کے معتقد تھے اسی طرح سادہ لوح اور اَن پڑھ طبقہ اس کی سادگی اور شرافت کا گرویدہ تھا۔ فلسفیوں اور سرکاری عہدہ داروں نے

عوام سے مل کر اُسے اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا اور اس کی تربت مختلف عقائد اور خیالات کے انسانوں کا مرکز بن گئی ؎

حلقہ بستند سر تربت من نوحہ گراں
دلبراں، زہرہ وشاں، گلبدناں، سیم تناں

کیرکٹر کے لحاظ سے سپینوزا اپنے عہد کے بہترین انسانوں میں سے تھا۔ باوجودیکہ اُسے جماعت سے خارج اور آبائی ورثہ سے محروم کر دیا گیا اور بہت چھوٹی عمر میں زندگی کے وسیع میدان میں تنہا چھوڑ دیا گیا لیکن اس کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ ان صبر آزما حالات میں بھی اس نے اپنی ہمت کے سوا سب سہاروں کو ٹھکرا دیا۔ اس کے بدترین دشمن بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس کے خیالات کے سوائے اس کی زندگی کے دامن پر چھوٹے سے چھوٹا دھبہ بھی تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اس کے خیالات سے اتفاق نہ کریں۔ اس کی منطق کو رد کر دیں۔ اور اس کے فلسفۂ اخلاق کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ دیں۔ لیکن ایک معزز اور مخلص انسان ہونے کی حیثیت سے اس کا احترام نہ کرنا اپنے آپ کو انسانیت کے مرتبہ سے گرانا ہے۔

سپینوزا کا فلسفہ زندگی

اس کا فلسفہ عقیدۂ "ہمہ اوست" کی پہلی اور ایک ہی منظم صورت ہے جب احساسات کی حقیقی ماہیت اور ان کے اصلی اسباب ہم پر واضح ہو جاتے ہیں تو وہ احساسات ہم پر اثر انداز ہونے کی قوت کھو دیتے ہیں۔ ہم جتنا زیادہ ان کو سمجھتے ہیں اتنا ہی کم ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ جب ہم اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے ہیں کہ قدرت کے قوانین اٹل ہیں اور دنیا میں جو چیز جیسی بھی ہے ویسی اس لئے ہے کہ وہ ایسی ہی بنائی گئی ہے تو ہم کسی دوسرے انسان سے خفا نہیں ہو سکتے خواہ اس کا رویہ ہماری توقعات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ مصیبتیں ہمیں پریشان نہیں کر سکتیں اور ہم قسمت کی شکایت کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ قسمت کوئی وجود نہیں رکھتی۔ خوف ہمارے نزدیک نہیں بھٹک سکتا۔ کیونکہ ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے جب ہم یہ جان لیتے ہیں کہ ہمارا مستقبل جیسا بھی ہو گا بہتر ہی ہو گا۔ تو بے سروپا امیدوں کے پنجے سے

آزاد ہو جاتے ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ سب اشیاء قدرت کے لافانی نظام میں اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں۔ تو ماضی و مستقبل ہماری نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

لیکن اگر ہم سپینوزا کے سارے کے سارے فلسفہ پر ایمان نہ لائیں۔ پھر بھی ہمیں اس بے لوث اور پر سکون شرافت سے جو اس کے نظریات زندگی پر روپہلی چاندنی کی طرح پھیلی ہوئی ہے آنکھیں بند نہیں کرنی چاہئیں۔ وہ ایسی نیکی کو نیکی نہیں سمجھتا جس کے پیچھے اجر اور معاوضے کی خواہش چھپی ہوئی ہے۔ نیکی اس کے نزدیک انسانی روح کے اندر خدا کی قوت ہے۔ اور تمام انسانی خواہشات کی آخری منزل۔ ہماری خواہشات کے عام مقاصد اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اگر ایک شخص ان کو پاتا ہے تو دوسرا کھوتا ہے یعنی ایک کا فائدہ دوسرے کے نقصان ہی سے ہو سکتا ہے (جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے) اور صرف یہی چیز اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ وہ اس قابل نہیں کہ انسان ان کے لئے دوڑ دھوپ کرے۔ لیکن خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ ہم سب کے لئے کافی ہے اور جو شخص اس دولت کو پا لیتا ہے اس کی خواہش صرف یہ ہوتی ہے کہ اسے دوسروں میں تقسیم کرے اور سب انسانوں کو اتنا ہی مسرور بنائے جتنا کہ وہ خود ہے۔ جو شخص خدا سے محبت کرتا ہے وہ اس بات کی خواہش نہیں کرتا کہ خدا بھی اس کے بدلے میں اس سے جانب دارانہ محبت کا سلوک روا رکھے۔ کیونکہ یہ تو اس بات کی خواہش ہوگی کہ خدا اس کی خاطر اپنی ناقابلِ تبدیل فطرت کو بدل ڈالے اور اس طرح اپنے بلند مرتبہ سے نیچے اُتر آئے۔"

دین و دولت | آؤ اب ہم اس کی چار کتابوں پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ اس کی سب سے پہلی کتاب "رسالہ دین و دولت" (The Treatise on govt. and State) آج ہمارے لئے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ کیونکہ تحریک تنقیدات عالیہ کے جن مسائل کے لئے سپینوزا نے اپنی جان تک کی بازی لگا دی آج وہ ہمارے لئے بالکل فرسودہ ہو چکے ہیں۔ کتاب کا ماحصل یہ ہے کہ بائیبل کی زبان استعاری اور مجازی ہے۔" سب مذہبی کتابیں عوام

کے لئے بلکہ دنیا کے سب انسانوں کے لئے ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کی زبان اور ذہنِ عوام میں تطابق ہونا ضروری ہے۔ سب پیشوایانِ مذہب اپنے نظریات کو عوام تک پہنچانے کے لئے عقل کی بجائے قوتِ متخلیہ سے اپیل کرتے ہیں۔" (باب ۵) "مذہبی صحائف اشیاء کی ماہیت کو ان کے ثانوی علل کے ذریعہ سے واضح نہیں کرتے بلکہ اس ترتیب سے اور ایسے اسٹائل میں ان کو بیان کرتے ہیں جو عام انسانوں خاصکر اَن پڑھ انسانوں میں مذہبی عقیدت کی روح پھونک سکیں۔ اُن کا مقصد عقلی ثبوت پیش کرنا نہیں بلکہ قوتِ متخلیہ کو متاثر کر کے اس پر قابو پانا ہوتا ہے" (باب ۶) "عوام کا خیال ہے کہ خدائیتعالیٰ کی قدرت اور طاقت کا صحیح اندازہ انہی واقعات سے ہو سکتا ہے جو غیر معمولی، خلافِ فطرت اور ان کے اپنے تصورات کے برعکس ہوں۔ حتّٰی کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک نیچر معمول کے مطابق کام کرتی ہے۔ خدائیتعالیٰ گویا بیکار بیٹھے رہتے ہیں اور جب تک خدائے تعالیٰ سرگرم عمل رہیں فطرت اور فطری آئین گویا معطل ہو جاتے ہیں یعنی وہ خدا اور فطرت کو دو الگ الگ اور مخصوص قوتیں تصور کرتے ہیں۔" (باب ۶)

یہاں سپینوزا نے اپنے فلسفہ کا بنیادی خیال ظاہر کر دیا ہے کہ خدا، فطرت اور قوانینِ فطرت ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔

"عوام اپنی خوش فہمیوں کی بنا پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا ان کی خاطر قوانینِ فطرت کو تبدیل یا معطل کر دیتا ہے اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں۔" (باب ۶) "فلاسفر جانتا ہے کہ خدا اور فطرت ایک ہی ہیں۔ اور غیر متغیر قوانین کے مطابق عمل پیرا ہیں۔ وہ ان غیر متغیر قوانینِ فطرت کا احترام کرتا ہے۔ اور ان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔" (باب ۵) وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر مذہبی صحائف میں "خدائیتعالیٰ کو واضعِ قوانین یا حاکم کی حیثیت میں پیش کیا جاتا ہے اور اسے منصف اور رحیم بتایا جاتا ہے تو یہ محض عوام کی سمجھ اور ان کے غیر مکمل علم کے تقاضہ کی بنا پر ہے۔ لیکن دراصل خدائیتعالیٰ کے اعمال اس کی فطرت کے لازمی نتائج ہیں اور اس کے قوانین ابدی (اور غیر متغیر) حقیقتیں ہیں (باب ۴)

ذہنی اصلاح | اب ہم اس کی دوسری کتاب "ذہنی اصلاح" (Improvement of Intellect) کو لیتے ہیں۔ اس کے خیال کے مطابق قوت اور آزادی علم میں مضمر ہیں اور صرف علم کی جستجو ہی مستقل خوشی کا سامان بہم پہنچا سکتی ہے۔ لیکن علم کا متلاشی انسان ایک شہری کی حیثیت بھی رکھتا ہے اس لحاظ سے اس کی زندگی کے اصول کیا ہونے چاہئیں؟ سپنوزا نے اس مقصد کے لئے تین اصول بیان کئے ہیں۔

(۱) ایسے طریق سے گفتگو کرنا کہ عوام اُسے آسانی سے سمجھ سکیں اور دوسروں کے لئے سب کچھ کر گذرنا بشرطیکہ وہ ہمارے مقاصد میں سدِّراہ نہ ہو۔

(۲) صرف ایسی خوشیوں سے لطف اندوز ہونا جو صحت کے تحفظ کے لئے ضروری ہوں۔

(۳) صرف اسی قدر دولت فراہم کرنا جو زندگی اور تندرستی کے قیام کے لئے لازمی ہو اور صرف انہی رسوم کی پابندی اختیار کرنا جو ہمارے مقاصد کے خلاف نہ جائیں۔

لیکن علم کے راستہ پر گامزن ہونے کے ساتھ ہی قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کس طرح معلوم ہو کہ ہمارا علم صحیح علم ہے۔ یا ہم کس طرح جانیں کہ جو تاثرات حواس کے ذریعہ ہمارے ذہن تک پہنچتے ہیں وہ قابلِ اعتماد ہیں اور ان تاثرات سے ہمارا ذہن جو نتائج اخذ کرتا ہے وہ درست ہیں۔ کیا علم کی منزل کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے یہ ضروری نہیں کہ ہم اپنے رہنما کا امتحان بھی کر لیں؟ کیونکہ ہماری کامیابی کا دارومدار بہت کچھ رہنما کے کمال پر ہے تو پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ سب سے پہلے ہم ذہن کی درستی اور اصلاح کے ذرائع وضع کریں؟ اور اس مقصد کے لئے ہمیں نہایت احتیاط سے علم کی مختلف صورتوں میں امتیاز کر کے ان میں بہترین صورت کو اختیار کرنا ہوگا۔

علم کا سب سے پہلا درجہ سُنی سنائی باتیں ہیں۔ مثلاً ایسے ہی علم کے ذریعہ ایک شخص یہ جانتا ہے کہ فلاں دن پیدا ہوا تھا۔ علم کا دوسرا درجہ مبہم تجربے کا ہے جس کے ذریعہ سے مثلاً ایک طبیب اپنے تجرباتی امتحانات کی ترتیب سے نہیں بلکہ ایک مجموعی گمان کی بنا پر کسی علاج کو

واقف ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وہ علاج عموماً کامیاب ثابت ہوتا رہا ہے۔ علم کا تیسرا درجہ وہ ہے جو استدلال کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ہم اس بات سے سورج کی وسعت کا اندازہ لگاتے ہیں کہ جتنی زیادہ فاصلہ پر کوئی چیز ہوگی۔ اتنی ہی اس کی جسامت اصلی جسامت سے کم معلوم ہوگی اور سورج باوجود اس قدر فاصلہ کے (۱۸۶۰۰۰ میل) اتنا بڑا دکھائی دیتا ہے۔

اس قسم کا علم اگرچہ پہلی دو اقسام پر فضیلت رکھتا ہے۔ لیکن پھر بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ ذاتی تجربہ اس کی تردید کر دے۔ جیسا کہ سائنس نے ایک سو سال کے استدلال سے ایتھر کو وضع کیا جسے اب علمائے طبعیات پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ علم کا چوتھا درجہ ہی اس کی بہترین اور مکمل ترین صورت ہے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ ۲ : ۴ :: ۳ : ۷ کے اربعۂ متناسبہ میں نامعلوم ہندسہ ۶ ہے۔ یا جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ 'کل' جزو سے بڑا ہوتا ہے لیکن سپینوزا اس اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ ہم بہت کم اشیاء کو اس علم کے ذریعہ سے جان سکتے ہیں۔

"اخلاقیات" میں سپینوزا علم کے پہلے دو درجوں کو ایک ہی صورت میں مدغم کر دیتا ہے، اور اس وجدانی علم کو اشیا کی ابدی حیثیتوں اور دائمی رشتوں کے ساتھ جاننے پر مبنی ٹھیراتا ہے (اور فلسفہ کی مختصر تعریف بھی یہی کرتا ہے) وجدانی علم اشیاء اور واقعات کے پردوں میں چھپے ہوئے قوانین اور ابدی رشتوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کے فلسفہ کا تمام نظام اشیاء و واقعات کی دنیا اور قوانین و تراکیب کی دنیا کے بنیادی امتیاز پر مبنی ہے اور وہ انھیں "دنیوی نظام" اور "ابدی نظام" کے ناموں سے موسوم کرتا ہے۔

اس کی تیسری کتاب "اخلاقیات" فلسفۂ جدید کی اہم ترین اور بیش بہا ترین تصنیف ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اقلیدس کی طرز پر لکھی گئی ہے تاکہ خیالات کی گتھیاں بھی ریاضی کے اصولوں کی طرح صاف اور واضح ہو جائیں۔ لیکن نتیجہ بالکل برعکس ہوا ہے۔ کتاب کی تحریر میں اس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے کہ ساری کتاب نہایت پیچیدہ اور مبہم بن گئی ہے۔ چونکہ یہ کتاب لاطینی میں لکھی گئی تھی۔ اس لئے سپینوزا کو مجبوراً اپنے نئے

خیالات پرانی اصطلاحات میں مقید کرنے پڑے۔ اور چونکہ وہ اصطلاحات اب اپنے اصلی معنوں میں مستعمل نہیں رہیں اس لئے کتاب اور بھی دقیق ہوگئی ہے اور اسے سمجھنے کے لئے نہایت گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

کتاب کو ہاتھ میں لیتے وقت ہمیں اس چیز کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ یہ کتاب جو صرف دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ سپینوزا کی تمام زندگی کی حکمت کا نچوڑ ہے۔ اور ساری کتاب میں ایک بیکار یا فالتو حرف بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اور اس کا ایک فقرہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور جب تک ساری کی ساری کتاب نہایت غور و خوض سے نہ پڑھی جائے اس کا کوئی اہم حصہ واضح نہیں ہوتا۔

فطرت اور خدا | سپینوزا کے خیال کے مطابق فطرت کے عالمگیر قوانین اور خدا تعالیٰ کے ابدی فرامین ایک ہی ہیں۔ "جس طرح ایک مثلث کے بارے میں یہ چیز ازازل تا ابد درست ہے کہ اس کے تینوں زاویے ملکر دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں۔ اسی طرح خدا کی ذاتِ لامتناہی سب چیزوں کا منبع ہے۔" ہماری مادی دنیا کو خدا سے وہی نسبت ہے جو ایک پل کو ریاضی اور میکانک کے اُن اصولوں سے ہوتی ہے جن کے ماتحت وہ تیار کیا جاتا ہے۔ اگر ان اصولوں کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو پل گر جائے گا۔ دنیا بھی ایک پل کی طرح خاص قوانین اور ساخت پر قائم ہے اور انہی قوانین کو ہم نے خدا کا نام دے رکھا ہے۔

چونکہ قوانینِ فطرت اور احکامِ خداوندی ایک ہی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں۔ اس لئے تمام واقعات جو ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان غیر متغیر قوانین کے میکانکی اعمال ہیں۔ جن کے اشاروں پر وہ کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں اور کسی غیر ذمہ دار اور مطلق العنان ہستی کے خبط کا نتیجہ نہیں ہوتے خدا کے احکام سب اسباب و علل اور اس کی فراست تمام ذہانتوں کا مجموعہ ہے۔

مادہ اور ذہن | (Matter & Mind.) سپینوزا کا خیال ہے کہ ذہن اور جسم الگ الگ نہیں بلکہ وہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ بیرونی حصہ کو ہم جسم۔ مادہ یا عمل کا نام دیتے ہیں اور

اندرونی کو خیال یا تصور کہتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی عمل ہے جو کسی غیر توضیحی طریق سے کبھی اندرونی اور کبھی بیرونی طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ جسم ذہن کے خیالات کا تعین نہیں کر سکتا) اور نہ ذہن جسم کی حرکات و سکنات کا فیصلہ کر سکتا ہے کیونکہ ذہن کا فیصلہ اور جسم کا عزم یا خواہش ایک ہی عمل کی دو مختلف صورتیں ہیں اور اسی طریق سے تمام دنیا متحد و مختلف ہے۔ جب کبھی ہم کسی بیرونی مادی عمل کو دیکھتے ہیں تو وہ حقیقی عمل کا صرف ایک ہی رُخ ہوتا ہے۔ اور داخلی اور نفسیاتی اعمال ہر مرحلے پر خارجی اور مادی اعمال سے تطابق رکھتے ہیں۔

ہر چیز اپنی خلقی فطرت کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور جس قوت کے ذریعے وہ اپنی خلقی فطرت کو قائم رکھتی ہے وہی اس کا حقیقی جوہر ہے اور اس فطرت یا جبلت کو قدرت ہماری بقا کا ذریعہ بناتی ہے۔ اور ہماری فطرت کی تسکین یا مزاحمت ہی کا نام خوشی اور تکلیف ہے، ہماری خوشیاں اور تکالیف ہماری خواہشات کا موجب نہیں ہوتیں، بلکہ ان کا نتیجہ ہوتی ہیں ہم کسی چیز کی خواہش اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ہمیں خوشی بخشتی ہے بلکہ کوئی چیز ہمیں اس لئے خوشی بخشتی ہے کہ ہم اس کی خواہش رکھتے ہیں۔ اور ہم کسی چیز کی خواہش اس لئے رکھتے ہیں کہ یہ بات ہماری فطرت میں داخل ہے۔ غرض ہمیں کوئی اختیار نہیں دیا گیا ضروریاتِ زندگی ہماری فطرت یا جبلت کی پرورش کرتی ہیں۔ ہماری فطرت یا جبلت ہماری خواہشات کو جنم دیتی ہے اور ہماری خواہشات، ہمارے خیالات اور اعمال کا موجب بنتی ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اس لئے مختار یا آزاد سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنے ارادوں اور خواہشات کا تو علم ہوتا ہے۔ لیکن ہم ان اسباب سے آگاہ نہیں ہوتے جو اُن خواہشات کی تخلیق کرتے ہیں۔

(باقی آئندہ)